Preface to Short Stories

Thirty years ago, during the mid-seventies, when I was studying law in Pakistan, I wrote two books of short stories. They were called *Ghantian* and *Ghunghru*. Together, they may be called *The Bells*. I was in my twenties and at the time I was introduced to English, Urdu, and Punjabi literature. I was also part of the young intellectual community of Lahore. We would gather in the American Council located near Fatima Jinnah Medical School. Friends would sit in the café below the Council's library and talk literature, world affairs, and politics. Many of these friends later joined the federal government; others were engineers most of whom who eventually migrated to America. The Bells emerged from intellectual experiences closely associated with the American Council.

The Bells are stories of relationships. Written in complex metaphorical and hidden language, each story traces the origin of a unique relationship that suffers from a disconnect between surface and reality. Each story produces a moment of surprise or mild shock. The slumber ends and the person is jolted into reality. This moment of *kashf* (revelation) is a bell. The bell rings to awaken the reader from a conventional understanding of the relationship narrated in the story. I don't know to what extent do I succeed in ringing this bell for the readers.

Some friends in Pakistan had the original copies. Maybe, some in the US do too. I am not sure if they still have them. I myself brought a couple of copies to the United States. I was so afraid to lose them that I framed a couple of them and hung them in my house. Fearful that they would be lost forever, I requested Martin Wisneski to digitize them and preserve them in the Washburn University archives. I thank him for doing this favor to me.

Hopefully, someone would take the time to translate them into English. Due to their unique metaphorical contents, it is highly unlikely that translations would reproduce the frigid passion of these stories. But those who can read Urdu will have more to say about the bells.

Liaquat Ali Khan
Washburn University
Topeka, Kansas
June 8, 2006.

P.S. In Pakistan and New York, many friends called me Naz. It was customary to give yourself a name to express your poetic self-image. I believe I chose the name Naz when I was six or seven years old and kept it during my adult years. I dropped this acquired name when I came to Topeka and officially when I became a US citizen. Many old friends, including Professors John Delaney and Mark Stavsky, still call me Naz. Professor Hisham Ramadan calls me Abu Kashif, a name I now like.

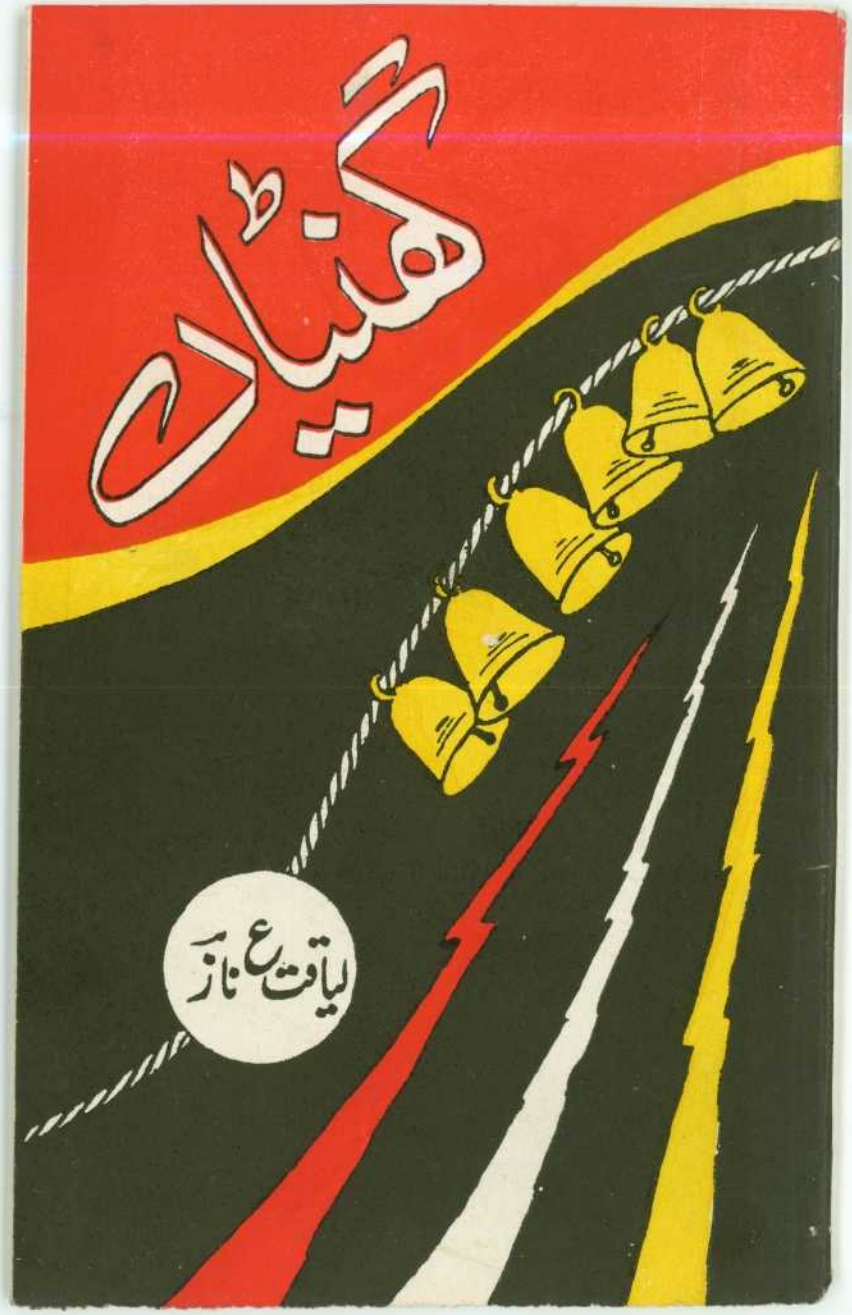

گھنٹیاں
لیاقت ع ناز

گھنٹیاں

لیاقت ع ناز
بی۔ایس۔سی (انجینیرنگ)، ایم۔اے (انگریزی)

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

پبلشرز ——— طارق پبلشرز
۳۴۳/اے جی ٹی روڈ لاہور

پرنٹرز ——— فرینڈز آرٹ پریس لاہور

قیمت ——— دو ۲ روپے

تعداد اشاعت ——— ۱۰۰۰

سنہ ۱۹۷۴ء

○

ابتدائیہ

کہ ستاروں کا سلسلہ ہوں
اپنے محور میں گھومتا ہوں
تری گلی کا فقیر ہوں لیکن
اپنی دنیا کا بادشاہ ہوں

○

لیاقت ع ناز

○

فہرس

زاویے ——— ۵

۱- مونگا سوکیو ——— ۱۱

۲- ماں بیٹی ——— ۱۶

۳- سرخ دوپٹے ——— ۲۱

۴- برف ——— ۲۸

۵- ایک حقیقت ——— ۳۲

۶- چھپکلی ——— ۳۷

زاویے

لیاقت علی ناز کا نام ادب کی دنیا میں ایک نیا اور اُبھرتا ہوا نام ہے۔ "گھنٹیاں" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ناز کا مغربی ادب کا مطالعہ اور معاشرے کی تلخ حقیقتوں سے آگاہی نے ان کے قلم کو ایک ایسی قوت بخشی ہے جس نے ان سے "گھنٹیاں" لکھوائی ہے۔

"گھنٹیاں" کتاب کا نام ہے اور یہی سب سے پہلے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ صرف ایک نام ہی نہیں بلکہ کتاب کا موضوع بھی ہے اور ناز کے سارے فن کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ مجموعہ دراصل گھنٹیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر افسانہ ایک گھنٹی ہے۔ جو پڑھنے والے کے ذہن میں جا کر اس زور سے بجتی ہے کہ وہ چونک جاتا ہے۔ چونکا دینے کا یہ عمل افسانے کی پہلی سطر سے شروع ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ جب ہم آخری سطر پر پہنچتے ہیں تو اچانک ایک دم خاموشی سی چھا جاتی ہے۔ ایسی خاموشی جو گھنٹیوں کی آواز سے زیادہ چونکا دینے والی ہے۔ اسی خاموشی

میں دوسرا افسانہ جنم لیتا ہے۔ جس میں پچھلے افسانے یا یوں کہیے کہ پچھلی گھنٹی کی گونج سنائی دیتی ہے اور یہ عمل جاری رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ساری کتاب میں ایک آہنگ ہے۔ یہ سب ایک آرکسٹرا کی طرح ہے جس میں مختلف ساز بجتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں۔ لیکن آرکسٹرا کے مجموعی تاثر میں ہر ساز شامل ہوتا ہے۔

کتاب کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ چند لمحات کا مجموعہ ہے۔ ہر افسانہ ایک ایسے لمحے کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے جسے ہم زندگی کا حاصل بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناز کے نزدیک ایک افسانہ نگار کا بنیادی مقصد بھی ایک ایسے ہی لمحے کو قید کر لینا ہے۔ جس میں وہ ساری جد وجہد شامل ہوتی ہے۔ جس کا حاصل اس خاص لمحے کا وجود ہے۔ کبھی یہ جد وجہد ذہنی ہوتی ہے اور کبھی جسمانی۔ اگر ہم اس لمحے کو سمجھ لیں تو نہ صرف ماضی بلکہ مستقبل بھی ہماری آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے۔ اس عمل کی سب سے اچھی مثال ناز کا ایک افسانہ "چھپکلی" ہے۔ جس میں ایک لڑکی کا ذہنی سفر اور کاوش دکھائی گئی ہے۔ افسانے کی آخری سطر ایک لمحہ ہے جو کئی زندگیوں سے زیادہ طویل ہے اور اسی ایک لمحے میں وہ اپنے آپ کو پہچانتی ہے اور اس کے شعور پر جمی ہوئی کائی اچانک پھٹ جاتی ہے۔ اس افسانے میں ناز نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جس سے یہ کتاب شروع ہوتی ہے۔ مجموعہ کا پہلا افسانہ ہے "ہم کون ہیں" باقی سارے افسانے اسی سوال کا جواب

ڈھونڈنے کی کوشش ہے۔ کئی قسم کے کرداروں اور حالات میں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈھونڈنے کی یہ کوشش ایک شعوری عمل ہے جسے ہم سوچ کا سفر بھی کہہ سکتے ہیں۔ ساری کتاب اسی عمل کا نتیجہ ہے جس سے کتاب کا بنیادی خیال جنم لیتا ہے۔ ہر پڑھنے والے کا کام بھی اسی خیال کو ڈھونڈنا ہے جو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کیونکہ ناز اپنے قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس کے لیے اس نے خاص مہارت سے کام لیا ہے۔ ادبے جا ابہام پیدا نہیں کیا۔ ابہام پیدا ہوتا ہے ان نظر انداز واقعات اور واقعات کی لڑیوں سے جو ایک فن کار جانتے بوجھتے یا بے خبری میں چھوڑ جاتا ہے۔ جب ایک عمل اور اس کے ردِ عمل میں کوئی منطقی رشتہ نہ ہو تو ایک قاری کی سوچ وہیں کہیں بھٹک جاتی ہے۔ جبکہ فن کار اس سے کہیں آگے ایک اور ایسا ہی عمل اور ردِ عمل بنانے میں مصروف ہوتا ہے۔ اس طرح ایک پڑھنے والا اپنے لکھنے والے کا ساتھ نہیں دے سکتا اور سارا افسانہ اس کے لیے ایک پہیلی بن جاتا ہے۔ ناز نے ایسا نہیں کیا ہے۔ اس نے جیسے سوچا ویسے ہی نہیں لکھ دیا سوچ کی لہریں دماغ کے پردے پر کچھ تصویریں بناتی ہیں۔ جن میں سے کچھ موجود اشیاء سے ملتی جلتی ہیں اور کچھ بالکل خیالی ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کی تصویریں تو ہر کوئی پہچان سکتا ہے لیکن دوسری قسم کی تصویریں زیادہ لوگوں کے لیے ہمیشہ اجنبی رہتی ہیں انہیں صرف فنکار ہی دیکھ سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے۔ سوچ کا عمل جب آگے چلتا ہے تو الفاظ وجود میں آکر ان تصاویر کو بیان

کرتے ہیں۔ اب یہ فن کار پر ہے کہ وہ کن تصویروں کو منتخب کرتا ہے اور کنھیں چھوڑ دیتا ہے۔ نازؔ نے پہلی قسم کی تصویروں کو چنا ہے۔ اُن کی ہر تصویر ایک واضح تصوّر رکھتی ہے جسے ہر کوئی جان پہچان سکتا ہے۔ اس لیے جب کوئی یہ افسانے پڑھتا ہے تو الفاظ پڑھنے والے کے ذہن پر پھر اُس قسم کی تصویریں بناتے ہیں جو فنکار کے ذہن میں بنی تھیں۔ نازؔ نے جو اشارے اور استعارے استعمال کیے ہیں۔ اُن میں بھی ایک قدرتی ربط موجود ہے۔ ایک استعارہ دوسرے استعارے کو جنم دیتا ہے۔ جس سے بنیادی طور پر نازؔ کے ہر افسانے میں ایک ہی بڑی اور واضح تصویر دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ نازؔ تصویروں کے ذریعے بات کرتا ہے اس لیے ان کا فن انگریزی کے شاعر DONNE (ڈن) سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن اُنھوں نے شاعری نہیں کی! اور وہ ابہام جو اس شاعر میں ملتا ہے اُسی طرح نہیں اپنایا گیا۔

اس ضمن میں ایک اور بات بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ نازؔ نے اپنے کچھ افسانوں میں الفاظ کا استعمال بڑی محنت سے کیا ہے۔ "برف" میں تو اس نے زبان کے بھی کچھ نئے تجربات کیے ہیں۔ یہ تجربات ان خیالی تصویروں کو بیان کرنے کے لیے کیے گئے ہیں جو اس افسانے کی ایک خصوصیت ہے۔ جیسے

"ایک آسمانی صحیفے کو کسی نامعلوم طاقت نے گوشت کی
کلی میں بند کر دیا ہو"

یا پھر یہ استعارہ

"موتیا رنگی جھرّا سود"

نازؔ کی یہ کوشش بھی بہت کامیاب رہی ہے اور اِن تصویروں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ افسانہ ایک پہیلی نہیں بن پاتا۔

"برف" کے برعکس "ماں بیٹی" کا تاثر ایک ڈرامے کا سا ہے۔ ماں اور بیٹی کا رشتہ کچھ اس طرح ابھرتا ہے کہ ہر قدم پر پڑھنے والا چونک جاتا ہے بہت سے احساسات جو ایک دوسرے کی ضِد ہیں آپس میں ٹکرا کر یہ ڈرامائی عنصر پیدا کرتے ہیں۔ اس تاثر کی وجہ سے نازؔ کے عمومی کردار غیر معمولی کردار بن جاتے ہیں۔ جب افسانہ شروع ہوتا ہے تو ہر کردار ایک معمولی سا دکھائی دیتا ہے جو ایک عام سی زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن جوں جوں افسانہ آگے بڑھتا ہے حالات بدلتے جاتے ہیں۔ جن میں وہ کردار اپنی اصلی شکل میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس بارے میں نازؔ کرداروں کی نیّتوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ تقریباً ہر افسانے میں ہر کردار کو ایک خاص لمحے میں ایک اہم فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ اس کی آئندہ زندگی کے لیے بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ نازؔ کے نزدیک قوتِ فیصلہ کا دارومدار بھی اس کی نیت پر ہی ہے۔ اور ہر وہ کردار جس میں کھوٹ ہے اس سے محروم ہے۔ اس کی مثال "ہم کون ہیں" میں مرد کا کردار ہے۔ وہ ہر موڑ پر اس لڑکی سے شکست کھاتا ہے جو اس کی گاڑی میں موجود ہے۔

ناز معاشرے کے وہ ناسور بھی بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے جنہیں ہم سب نے خود اپنی ہی نگاہوں سے چھپانے کے لیے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور جب کوئی کردار اپنے آپ کو پہچان کر ایک فیصلہ کرتا ہے تو ہماری بھی آنکھیں کھل جاتی ہیں ۔ ذہن میں ایک گھنٹی سی بجتی ہے جس کی گونج پڑھنے والے کے شعور میں ایک ارتعاش پیدا کر کے بتدریج خاموش ہو جاتی ہے ۔

شاھد بشیر

مونگا سوک یو[1]

بہت دور تک سڑک بہت سیدھی تھی ——

موسم خوشگوار ہو تو وہ ہمیشہ کار آہستہ چلاتا تھا اور اگر موسم کی خوشگواری کے ساتھ ساتھ سڑک بھی سیدھی ہو تو وہ بہت ہی آہستہ کار چلاتا تھا ۔

حسب معمول وہ آج بھی بہت آہستہ کار چلا رہا تھا ، کہ فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی ایک اکیلی لڑکی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکنا چاہا ۔ وہ رکا تو لڑکی نے انتہائی دھیمے انداز میں کہا ——

'لفٹ پلیز' ۔

اس نے کار کا دروازہ کھولا تو لڑکی آہستگی سے کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی ۔

"کہاں چلیے گا" لڑکے نے اس کے خوبصورت پرس کو دیکھتے ہوئے پوچھا ۔

---

[1] ہم کون ہیں

"دیکھئے سڑک تو بالکل سیدھی ہے" لڑکی کی بڑی بڑی آنکھوں میں ادھ کھلا تبسم تھا۔

لڑکے کے لیے یہ جواب خاصا غیر متوقع تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔

"آپ بہت آہستہ ڈرائیو کرتے ہیں"۔ لڑکی نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"آپ چاہیں تو تیز بھی ہو سکتا ہوں"۔

"نہیں رہنے دیجئے۔ موسم حسین ہو تو مجھے صرف دھیمی چیزیں اچھی لگتی ہیں"۔ لڑکی نے کہا۔

"لیکن آپ نے کپڑے تو خاصے شوخ پہن رکھے ہیں"۔ لڑکے کے لہجے میں بھی شوخی تھی۔

"جی ہاں ـــــ مگر میں تو صرف موسم کی بات کر رہی تھی"

وہ پھر خاموش بیٹھے سامنے تکتے رہے۔ شاید وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ تھوڑے ہی فاصلے پر سیدھی سڑک بائیں جانب مڑ جائیگی۔

موڑ پر پہنچتے ہی لڑکے نے لڑکی کی طرف دیکھا تو لڑکی کی آنکھوں میں ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی جیسے کہہ رہی ہو ـــــ

"چونکہ سڑک صرف بائیں جانب ہی مڑتی ہے اس لیے کار بھی صرف بائیں جانب ہی مڑ سکے گی۔

لڑکے نے چپ چاپ بائیں جانب گھومتی سڑک پر کار موڑ

دی۔ سڑک پھر سیدھی تھی ـــــ

"آپ پڑھتی ہیں"۔ لڑکے نے لڑکی کی کلائی پہ سجے ہوئے موتیا کے گجروں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" لڑکی نے اپنا پرس کھولتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ پڑھتے ہیں"۔ لڑکی نے جواباً پوچھا۔

"ہاں" لڑکے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ صرف یہی ایک لفظ جانتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے وہ ساری زبان بھول چکا تھا۔

وہ پھر خاموش بیٹھے رہے۔ کافی دیر تک

سیدھی سڑک ایک دوراہے پر ختم ہونے والی تھی۔

"لیفٹ چلئے گا یا رائٹ"۔ لڑکے نے پوچھا۔

"آپ کو کس طرف جانا ہے" لڑکی کی آنکھوں میں اب جانی پہچانی مسکراہٹ تھی۔

"نہیں پہلے آپ بتائیں گی"۔ لڑکے نے دوراہے پر کار روک دی۔

"آپ تو ضد کرتے ہیں۔ دیکھئے پہلے آپ ہی بتائیں گے"

وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں شاید کچھ ٹٹولتے رہے۔ نہ جانے کیا۔

لڑکی کو بضد دیکھ کر لڑکے نے کہا ـــــ "لیفٹ تو چلیے"۔ لڑکی نے بائیں جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

سڑک پھر سیدھی تھی ——

وہ خاموش تھے - دو چٹانوں کی طرح - ایک ویرانے کی طرح۔

"مونگا سوک یو" —— لڑکی نے انتہائی پُراسرار انداز میں پُوچھا۔

"انسان" —— لڑکے نے برجستہ جواب دیا - جیسے وہ بڑی دیر سے اس سوال کا منتظر تھا۔

"نہیں - ہم اجنبی ہیں - ناواقف" —— لڑکی کے لہجے میں ٹھہرے ہوئے جہاں کا سکوت تھا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر سڑک پھر دو شاخوں میں تقسیم ہو رہی تھی - منافق کے ایمان کی طرح -

"دیکھئے اس دفعہ آپ پہلے بتائیں گی کہ آپ کو کون سی جانب جانا ہے" - لڑکے نے فاتحانہ مسکراہٹ سے پوچھا۔ جیسے اب لڑکی کے پاس پہلے نہ بتانے کا کوئی جواز ہی باقی نہ رہا ہو۔

"آپ جانتے ہیں - مَیں نے پہلے بھی انکار کر دیا تھا" - لڑکی نے اس اعتماد سے جواب دیا جیسے کوئی آسمانی آیت دوہرا رہی ہو۔

"مجھے پھر لیفٹ جانا ہے" لڑکے نے شعوری ہار مانتے ہوئے کہا۔

"تو مجھے اُتار دیجئے" —— لڑکی کار کا دروازہ کھول کر باہر

نکل آئی۔

"مگر کیوں" —— لڑکے نے حیرانگی سے پوچھا

"دیکھئے نا - آخر تو مجھے اُترنا ہی تھا - یوں سمجھ لیجئے کہ مجھے یہیں اُترنا تھا" —— آپ کا بہت شکریہ۔

لڑکی کی بڑی بڑی آنکھوں میں جواں کلیوں کی سی مسکراہٹ تھی۔

لڑکا کچھ دیر حیراں اپنی کار میں تصویر بنا رہا۔

بائیں جانب گھومنے والی سڑک پھر خاصی سیدھی تھی ——

ماں بیٹی

ماں بیٹی کی عمر میں اگرچہ سترہ سال کا فرق تھا - لیکن وہ نہیں لگتی تھیں اور جب کبھی وہ دونوں شاپنگ کے لیے بازار میں نکلتیں تو ہر دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ دو خوبصورت سہیلیاں ہیں ماں ماں ہونے کے باوجود بالکل کنواری لڑکیوں کی طرح خوش مزاج - پھرتیلی اور تیز و طرار تھی - بیٹی نے ماں سے خاصی چیزیں بعینہٖ اختیار کر لی تھیں - دونوں کے ہنسنے اور چلنے کا طریقہ بالکل ایک جیسا تھا - ان دونوں کو ایک طرح کے لباس اور رنگ پسند تھے - ایک ہی طرح کی موسیقی اور دونوں ایک ہی طرح کی رومانی فلموں کا شوق رکھتی تھیں - اب تو دونوں کی تعلیم بھی ایک ہی تھی. دونوں ایم - اے تھیں - ماں نے نفسیات میں ایم - اے کیا تھا' اور بیٹی نے تھوڑی دیر ہوئی انگریزی میں ایم اے پاس کیا تھا -

ان کی دوستی کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ رَوبی کا باپ اس کے ہوش سنبھالتے ہی فوت ہو گیا تھا - ماں نے بیٹی کو اتنے پیار سے پالا

پڑھایا کہ بیٹی کو کبھی کبھار ہی اپنے باپ کی کمی محسوس ہوئی ہو گی - رَوبی کا نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن - بس ماں ہی ماں تھی اور اتفاقاً ماں بھی اپنے والدین کا اکلوتا بچہ تھی - اِن حالات میں وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب تھیں کہ ایک دوسرے کو تمام رشتوں کا پیار بانٹتی تھیں - انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ علیحدہ بھی ہوں گی - چونکہ رَوبی شروع ہی سے ماں کے ساتھ سوتی تھی اِس لیے ابھی تک وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی سوتی تھی - ماں کے کہنے پر اس نے کئی بار علیحدہ سونے کی کوشش بھی کی - لیکن دس پندرہ منٹ اکیلے لیٹنے کے بعد اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے سارے جسم میں ٹھنڈے ٹھنڈے کیل چبھ رہے ہوں - وہ اُٹھتی اور بھاگ کر اپنی ماں کے پلنگ پر دھڑم سے آ گرتی اور اپنی پوری طاقت سے اپنی ماں کو اپنی باہنوں کی گرفت میں لے لیتی - اب تو رَوبی کی ماں نے اسے علیحدہ سونے کو کہنا ہی بند کر دیا تھا - وہ جانتی تھی کہ رَوبی کبھی اس سے علیحدہ نہیں سو سکتی -

رَوبی کے فائنل امتحان کے نتیجے کے دن ماں نے جب اس کو شادی کے لیے ٹٹولا تو روبی نے ایک دم چیخ کر رونا شروع کر دیا - وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی ماں اتنی بیدردی سے اس سے علیحدہ ہونے کے پلان بنا رہی ہو گی - رَوبی خوب بگڑی - اس نے دوپہر کا کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا - ماں

نے بہتیرا سمجھایا کہ اس نے تو صرف شادی کی بات کی ہے۔ کوئی واقعی رچا تو نہیں دی۔ لیکن روبی نے ایک نہ مانی اور رات ڈھلے تک مسلسل روتی رہی۔ ماں نے غصّے سے، پیار سے سب طریقوں سے منانے کی کوشش کی لیکن روبی ضدی بچے کی طرح منہ بسورے بیٹھی رہی۔ آخر تھک ہار کر ماں نے منانا چھوڑ دیا اور اپنے پلنگ پر جا لیٹی۔ وہ سوچ رہی تھی آج تو روبی کو اکیلا ہی سونا پڑے گا۔ سارا دن اتنا خفا رہنے کے بعد اب رات کو کس منہ کے ساتھ ماں کے ساتھ سوئے گی۔ پہلے تو روبی کچھ دیر اکیلی بیٹھی رہی لیکن جونہی ماں نے بیڈ روم کی بتّی بجھائی۔ روبی تیز بلّی کی طرح پھلانگتے ہوئے دھڑم سے اپنے ماں کے پلنگ پر آ پہنچی اور عجیب ڈھیٹ لہجے میں بولی ——— "اچھا کہو کہ تم میری شادی نہیں کرو گی" ———

(ماں نے کچھ نہ کہا۔ روبی اپنی ماں کے ساتھ چمٹ گئی اور اس کا منہ چومتے ہوئے متواتر کہے جا رہی تھی۔ "کہو کہ تم میری شادی نہیں کرو گی ——— کہو کہ تم میری شادی نہیں کرو گی ——— کہو ———" ماں کیا بولتی وہ کسی گہری سوچ کا شکار ہو چکی تھی۔ روبی نے ماں کو اپنی بانہوں کی گرفت میں لے کر چومنا اور رونا شروع کر دیا اور یہاں تک کہ چومتے چومتے۔ روتے روتے وہ ضدّی بچے کی طرح تھک کر سو گئی۔ ماں سوچ کا بے جان پتھر بنی اپنی بیٹی کی بانہوں میں پھٹے دیدوں سے جانے کیا اندھیروں میں تلاش کر

رہی تھی۔

روبی کی ماں ساری رات جاگتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے۔ شادی کے نام پر اتنا بگڑنا۔ سارا دن بگڑے رہنا اور رات کو عین سونے کے وقت ٹھیک ہو جانا۔ یہ سب کیا ہے۔ روبی کیا چاہتی ہے۔ روبی کوئی بچّی تو نہیں کہ ضد نہ سمجھتی ہو اور آخر اس سے پہلے روبی نے کبھی بھی تو ضد نہیں کی۔ وہ تو انتہائی نرم دل اور ٹھنڈے مزاج کی لڑکی تھی۔ یہ سب کیا ہے۔ وہ روبی کے شعور کی گہرائیوں میں وہ چیز تلاش کر رہی تھی۔ جس نے روبی جیسی ذہین اور خوب صورت لڑکی کو غیر متوازن بنا دیا تھا۔ وہ خود اپنے شعور کے ان تمام زشتروں سے بھی معرکہ آرا تھی۔ جو آج سے پہلے اُسے ایک میٹھی میٹھی چبھن کا مزہ دیتے رہے تھے۔

شاہد نے دروازہ کھولا تو روبی تھی۔ مغرور روبی۔ شاہد کو دیکھتے ہی وہ اس سے لپٹ گئی اور اس کے کاندھے پر سر رکھ کر رونا شروع کر دیا۔ شاہد کے لیے یہ بالکل غیر متوقع اور عجیب و غریب منظر تھا۔ اُسے اپنے جاگنے پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا یہ وہی روبی ہے جس سے وہ بے انتہا محبت کرتا ہے کیا یہ وہی روبی ہے۔ جو کلاس کی مغرور ترین لڑکی تھی اور جس نے کبھی کسی لڑکے سے آنکھیں بھی نہیں ملائی تھیں۔ یہ سب کیا ہے۔ وہ

سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دِن جب وہ اچانک دروازہ کھولے گا تو روبی دھڑم سے اس کی بانہوں میں آگرے گی ـــــ شاہد مجھ سے شادی کرلو۔ پلیز شاہد۔ خدا کے لیے مجھ سے شادی کرلو۔ ورنہ مَیں مرجاؤں گی ـــــ ورنہ مَیں مرجاؤں گی' ـــــ روبی اس کے کاندھے پر سر رکھ کر التجا کرتی رہی۔ شاہد متواتر کہے جارہا تھا کہ ہاں ہاں روبی مَیں تم سے ضرور شادی کروں گا'۔ مگر وہ شاہد کی بات سُنی اَن سُنی کرکے وہی رَٹ لگائے جارہی تھی' ـــ 'شاہد پلیز مجھ سے شادی کرلو' ـــــ کیا روبی پاگل تو نہیں ہوگئی۔ نہیں وہ بالکل ٹھیک تھی۔ صِرف رو رہی تھی۔ جیسے کوئی مرگیا ہو ہمیشہ کے لیے۔ آخر جب روبی نے رونا بند کیا تو شاہد نے اسے اپنے جسم سے علیحدہ کرتے ہوئے کرسی پر بٹھایا وہ بالکل ٹھیک تھی۔ مغرور روبی۔ شاہد نے روبی کو ٹھیک پاکر جب پوچھا کہ کیا بات ہوئی ہے تو روبی کے ہونٹ بھینچ گئے اور وہ نفرت اور انتقام کے مِلے جُلے لہجے میں بولی۔

" شاہد میری ماں نے دوسری شادی کرلی ہے "۔

سُرخ دَھبّے

چیا نماز کی بڑی پکّی تھی ـــــ بالکل اخروٹ کی طرح جو توڑے نہ ٹوٹے۔ چیا کو اچھی طرح یاد ہے جب اُس نے پہلی بار' وہ' دُعا مانگی تھی۔ بہت چھوٹی تھی وہ تب۔ بابا نے اُسے نیا فراک خرید کر دیا تھا۔ سُرخ فراک پہنے وہ ناچتی پھر رہی تھی۔ بہت خوش۔ ماں نے دیکھا تو ڈانٹا۔ ناچنے سے منع کیا اور فوری نماز پڑھنے کی تاکید کی۔

ننھے بازوؤں کو پیٹ پر باندھے چیا خدا کے حضور میں کھڑی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ نماز سے فراغ ہو کر جب اس نے دونوں ہاتھوں کو دُعا کے لیے کشکول بنایا تو اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔ زبان جیسے نارنجی پتھر ہوگئی ہو۔ اس نے دل ہی دِل میں کچھ کہنا چاہا۔ مگر پھر بھی اسے شرم سی آگئی۔ خود سے۔ خدا سے اس نے گھبرا کے چاروں طرف دیکھا کہ کہیں اُسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ وہی ہُوا جس کا اُسے ڈر تھا۔ بابا بڑی ہنس مکھ نظروں سے

اپنی لاڈلی ننھی کو جائے نماز پہ بیٹھے تک رہا تھا - بابا کی آنکھوں میں دیکھتے ہی چیا کی گالوں میں ایک سُرخ جھونکہ سرایت کر گیا - جلدی جلدی اپنے منہ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ تیزی سے اُٹھی اور بھاگ کر کمرے میں چلی گئی - تکیے میں مُنہ چھپاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی ——— ' بابا اور اللہ میاں کیا کہیں گے - چیا اتنی بے شرم ہے - ابھی سے شادی کی دعائیں مانگتی ہے '

تب سے چیا نماز کی بڑی پکی تھی -

چیا نے اپنی ہوش میں صرف ایک نماز جان بوجھ کر قضا کی تھی اس دن گھر میں وہ بالکل اکیلی تھی - بابا دکان پہ تھا - اماں محلے میں کسی موت پہ گئی تھیں - اور بڑی بہن ہسپتال میں اپنی بچی کو دکھانے سویرا پھوٹتے ہی نکل گئی تھی -

خود کو اکیلی پاکر چیا کو یوں محسوس ہوا جیسے شیطان نے اُسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا ہو - اس نے لاکھ جتن کیے کہ وضو کرے اور ظہر کی نماز ادا کرے لیکن نہیں - جانے کون سی طاقت نے اس کی ایمانی حرارت کو یکدم سرد کر دیا تھا ——— وہ اُٹھی مگر پھر لیٹ گئی - اس کے جسم کے سارے ریشوں میں ایک عجیب درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں - اس کا جی چاہا کہ وہ خوب مَل مَل کر نہائے -

چیا نل کی دھار تلے خوب نہاتی رہی - نہانے کے بعد اُس نے

بالوں میں کنگھی کی - آنکھوں میں کاجل لگایا - سُرخ رنگ کا دھلا ہوا جوڑا پہنا، اور دھیرے دھیرے گلاب کے گملے کی طرف چلنے لگی - ایک خوبصورت سرخ پھول سبز ٹہنی پر جھوم رہا تھا - اُس کا جی چاہا اُسے توڑ کر اپنے بالوں میں سجا لے لیکن جیسے کسی نے اُس کا ہاتھ روک لیا ہو - وہ سوچنے لگی یہ پھول اُس کے بے جان بالوں میں بہت جلد سوکھ جائے گا - اُسے اِسی نازک شاخ پہ جھومنا چاہیے -

جب پھول کی شاہ رگ کو نازک شاخ سے جُدا کر دیا جاتا ہے تو نہ اُسے سبز زندگی ملتی ہے نہ سُرخ پریت -

وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ سُرخ پھول اس کے بالوں کی سرسوں میں دم توڑ دے -

سوچ کے دریچوں سے باہر نکل کر وہ صحن میں چارپائی پر لیٹ گئی - گلی میں بچوں کے کھیلنے کا شور ختم ہو چکا تھا - شاید وہ کھیل کے جھونکوں پر سوار کھلے میدان میں جا نکلے تھے - گھر میں صرف کبوتروں کے قفس سے غٹرغوں غٹرغوں کی آواز آ رہی تھی - آہستہ آہستہ ان کی مجموعی آواز اتنی تیز ہو گئی کہ چیا کا جی چاہا یا تو وہ ان سارے کبوتروں کا گلہ گھونٹ دے یا پھر اُن کے کٹے پروں کو واپس باندھ کر کھلی فضاؤں میں چھوڑ دے - لیکن وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی - کبوتر تو بابا کے تھے - بابا کو لڑکپن ہی سے کبوتر پالنے کا شوق تھا -

غٹرغوں کے اس شور سے تنگ آکر وہ چھت پر آ چڑھی - کبوتر

اُس کے پاؤں کی آہٹ سے ڈرتے ہوئے پنجرے میں کُلبلانے لگے۔ چیّا نے زور سے "رشی" کی آواز نکالی تو کبوتر چُپ ہوگئے۔ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے پوری کائنات چُپ ہوگئی ہو۔ اپنی کہنیاں منڈیر پر رکھتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس لی اور دھیرے سے خود سے پُوچھا ——— "چیّا تیرا بیاہ کب ہوگا۔ تُونے اس منڈیر پر کھڑے نیچے گلی میں گُزرتے کئی باراتیں دیکھی ہیں۔ تیری اپنی بارات۔ باجوں سے سجی، گھوڑی کے گھنگھروؤں پہ جھومتی کب آئے گی ——— وہ کون ہوگا، چیا! ———"

اس خیال سے وہ لرز گئی۔ کبوتروں کے غٹرغوں کی آواز پھر تیز ہو گئی اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اُس کا بابا بُلا رہا ہے۔ اُسے بابا سے بڑا ڈر لگتا تھا۔

بابا کے لمبے تڑنگے ہاتھوں سے۔ اُسے وہ دن کبھی نہیں بھُولے گا۔ جب اس کی ماں ننگے سر گلی میں سبزی خرید رہی تھی کہ اُوپر سے بابا آگئے۔ بابا نے اماں کو اپنے ہاتھوں سے اتنا مارا تھا کہ اماں بے ہوش ہوگئی تھی۔ بے چاری اماں۔ پورے دو گھنٹے بعد ہوش آیا تھا ——— لیکن بابا ظالم تو نہیں ہیں۔ نہیں نہیں بابا تو بہت اچھے ہیں۔ اس میں اماں کا بھی تو قصور تھا۔ بالکل ننگے سر تھی نا۔ بابا تو فرشتہ ہیں۔ بہت محنت کرتے ہیں۔ صبح منہ اندھیرے گھر سے نکلتے ہیں۔ سارا دِن دُکان پر کام کرنا کوئی معمولی بات تو نہیں ——— اور مجھ سے تو وہ بہت محبت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں چیّا بیٹی کے لیے بہت بڑا جہیز تیار کرنا ہے۔ وہ بڑے

اچھے لڑکے سے مجھے بیاہنا چاہتے ہیں ——— مگر اچھے لڑکے مِلتے ہی کہاں ہیں اس میں بابا کا کیا قصور ———

چیّا چپ زندگی کا ناٹک دیکھتی رہی۔ اچھے لڑکے کی تلاش جاری رہی۔ اس کے داج کی چیزیں بنتی رہیں، بگڑتی رہیں، سال جھونکوں کی طرح آتے اور گزر جاتے۔ بابا دن رات محنت کی چکّی پیستے رہے۔ چیّا منڈیر پر کھڑی باراتیں دیکھتی رہی۔ کبوتر اپنی غٹرغوں کا راگ الاپتے رہے ——— زندگی کا پہیّہ گھومتا رہا ——— چکّر۔

اب تو نماز کے بعد چیا خاصی بے شرمی سے اپنی شادی کی دعائیں مانگتی مگر کہاں ——— سر دیوتا کا جی نہ پسیجا۔ بابا جی ہی جی میں خوش بھی تھا ——— وہ سوچتا ——— چیّا بیٹی کتنی سُندر ہے۔ نماز نہیں چھوڑتی۔ دیکھو تو ماتھے پر محراب اُبھر آیا ہے۔

مگر پچھلے چند دنوں سے چیّا نے نماز چھوڑ دی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ سر دیوتا کے خلاف کوئی احتجاج کر رہی تھی۔ نہیں یہ اس کی مجال کہاں ——— وہ اپنے جسم سے مجبور تھی۔ اس کے سارے بدن پر سُرخ دھبے اُبھر آئے تھے۔ موٹے موٹے لال لال دھبّے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے خون نے اس کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ وہ جگہ جگہ سے۔ لوں لوں سے باہر اُمڈنا چاہتا تھا۔ چیا کے جسم کا چپہ چپہ جُھلس رہا تھا۔ جیسے وہ لوہے کے سُرخ انگاروں پر بندھی ہو۔ اس عذاب نے احساسِ ثواب کو نگل لیا تھا وہ نماز کا سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ اس کا سیاہ محراب سُرخ بغاوت کا شکار

ہو چکا تھا۔ اب اس کا رنگ سُرخیلا سیاہ تھا۔

وہ سوچتی کاش اس کا خالہ زاد بھائی پیجی ہی پڑھا لکھا ہوتا۔ اچھا خاصا جوان آدمی ہے۔ دکان کرتا ہے تو کیا ہُوا۔ بابا بھی تو دکان کرتے ہیں۔ لیکن کون سمجھائے بابا کو۔ وہ تو کہتے ہیں ——— "چیا کا بیاہ تو کسی بابو سے کرنا ہے ——— کاش پیجی ہی بابو ہوتا۔ بہت قد آور لگتا پتلون کوٹ میں۔

آج گھر میں وہ پھر اکیلی تھی۔ صحن میں بیٹھی وہ اپنے سُرخ دھبوں کو سہلا رہی تھی کہ اچانک غٹر غوں کی آواز اس کا دماغ چھلنی کرنے لگی۔ وہ بھاگتی ہوئی چھت پر جا چڑھی اور اس نے بجلی سے زیادہ تیز ہاتھوں سے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ کبوتر گرتے پڑتے باہر چھت پہ آنکلے۔ جو اُڑ سکتے تھے اُڑ گئے۔ چیا کو یوں محسوس ہوا جیسے بابا کے لمبے تڑنگے ہاتھ فضا میں لہرا رہے ہیں۔ چیا کا جی دھل گیا۔ وہ گھبر کر دوبارہ کبوتروں کو پنجرے میں بند کر رہی تھی کہ اس کے کانوں میں آواز آئی۔

'یہ کیا کر رہی ہو چیا ———'

چیا نے پلٹ کر دیکھا تو پیجی کھڑا تھا۔

اور چیا کے سُرخ دھبے پیجی کی مضبوط بانہوں میں کاغذی باداموں کی طرح تڑ تڑ ٹوٹنے لگے۔

'چیا! نیچے آؤ چیا بیٹی ———' بابا کی موٹی آواز نے ایک لذیذ سناٹے کو توڑ دیا۔

چیا جیسے ڈر سے مر گئی ہو۔ پیجی کی گرفت سے نکل کر وہ

تیزی سے نیچے سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ربڑ کے گیند کی طرح اچھلتی گرتی نیچے فرش پہ آگری۔

"گر پڑی میری چیا بیٹی" ——— دیکھو تو تمہارا محراب چھل گیا ہے' ——— بابا نے چیا کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

چیا کی اماں نے سُرخ دوپٹے سے اس کا سُرخ ماتھا پونچھا اور اس پہ کس کر پٹی باندھ دی۔

بَرف

ہر دیکھنے والے کو اس کا سپید چہرہ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے بَرف کے پتّھر سے تراشا ہو۔ اگر وہ آنکھیں موندھ کر کسی مندر میں بیٹھ جائے تو لوگ امن کی دیوی سمجھ کر پُوجنا شروع کر دیں۔ سفید کپڑوں میں ملبوس تو وہ بالکل روم کی حور لگتی ہے اور اگر ایسے میں وہ ہَواؤں سے کھیلتی کسی کھُلی جگہ میں نِکل آئے تو ہر دیکھنے والے کو یوں محسوس ہو جیسے بادل کے سفید ٹکڑے نے خوبصورت عورت کا حاشیہ چرا لیا ہے۔ اُسے دیکھ کر ایک عجیب ٹھنڈک بدن کے ریشوں میں اُتر جاتی ہے اور سوچیں تو خیال آتا ہے جیسے آسمانی فرشتے اُسے جنّت کے ٹھنڈے پانیوں سے نہلا کر دھیرے سے زمین پر اُتار گئے ہوں۔ صبح سویرے وہ جب کبھی ننگے پاؤں اپنے باغیچے میں سیر کے لیے نکلتی تو ہر دیکھنے والے کی آنکھوں میں اتنا تقدس اُتر آتا جیسے وہ کسی عورت کو نہیں سنگِ مرمر پہ لکھے کسی آسمانی کلام کو دیکھ رہا ہے۔

وہ جانتی ہے کہ وہ کیسی لگتی ہے۔ بے شمار نظریں اس کا

یوں طواف کرتی ہیں جیسے وہ پریم کا موتیا رنگی حجرِ اسود ہو۔ بعض لوگ تو تکتے ہی رہ جاتے ہیں جیسے کسی آسمانی چاندی کا حسین ٹکڑا بھُولے سے زمین پر آ اُترا ہو۔ وہ جب کبھی کسی پارٹی میں شریک ہوتی تو پورا ماحول وجد کی پُرکیف شراب میں بھیگ جاتا —— وہ دِل ہی دِل میں سوچتی —— کیا میں عورت ہوں یا آسمانی صحیفہ جسے کسی نامعلوم طاقت نے گوشت کی کلی میں بند کر دیا ہے ——

لیکن عورت تو وہ ہے۔ بے شمار نوجوانوں نے اپنی محبت کا اظہار بھی تو کیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ وہ کتنے لوگوں کا آئیڈیل ہے۔ بے شمار خط اس بات کی شہادت ہیں کہ اَن گنت لوگ اُسے بے پناہ چاہتے ہیں۔ مگر اُسے اس کے سارے پریمی ایک جیسے لگتے ہیں۔ ان کے خطوں کی طرح۔ اور شاید یہ بات صحیح بھی ہے۔ اسے لکھے ہوئے خط پڑھ کر یہی احساس ہوتا ہے جیسے لکھنے والے گوشت پوست کے انسان نہیں موم سے بنے ہوئے وہ پجاری ہیں جو دیوتا کی دِلی ٹھنڈک کے لیے آگ کی باریک لو پہ پگھلتے رہتے ہیں۔ پگھل جاتے ہیں اور جن کے مقدس خط خون کی حرارت سے نہیں ذہن کے سیپاروں سے اُترتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ اس میں خون کی خاصی کمی ہے۔ ماہرینِ نفسیات نے اپنے تجزیوں میں صرف ایک بات پر زور دیا

ہے کہ بچپن میں ماحول کی بندشوں کی وجہ سے وہ زندگی کے ان سارے اشاروں کو گناہ کی سیاہی سمجھتی رہی ہے جو خون کی سُرخی کو دماغ کی حرارت میں بدلتے ہیں۔ اس کا ذہن صرف ضمیر کی وہ چار دیواری ہے جس میں ساری منفی طاقتوں کو بند کر دیا گیا ہے۔ اس کا ذہن صرف اس کا ضمیر ہے۔ وہ سوچتی نہیں صرف یاد کرتی ہے۔

کاغان کی چوٹیوں پہ جب سورج کی تپش سے برف پگھلتی ہے تو اس یخ بستہ وادیوں سے اُسے اس کی ایک سہیلی ملنے آتی ہے۔ وہ سہیلی جو دنیا میں اُسے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ بہت مزے دار باتیں کرتی ہے۔ ایسی باتیں جن میں آگ ہی آگ ہو۔ وہ گھنٹوں چپ بیٹھی اس کے انگارے بھرے گالوں کو تکتی رہتی ہے جس میں جب زندگی کا خونی رس سورج کی شعاعوں سے کھیلتا ہے تو اس کے اپنے اندر کوئی چیز تڑاخ تڑاخ ٹوٹنے لگتی ہے۔ شاید یہ برف کے وہ شیشے ہیں جو سالوں سے اس کی رُوح میں یخ بستہ ہو چکے تھے۔ وہ حیران ہے کہ کاغان کی یہ گڑیا جس کی ساری عمر برف کے لحاف میں گذری ہے۔ اپنے اندر اتنی تپش کہاں سے سمیٹ لائی ہے۔ اس کی سہیلی نے اسے سب کچھ بتایا ہے لیکن پھر بھی وہ حیران مندر کی طرح دُور بجنے والی گھنٹیوں کو سُن تو سکتی ہے، سمجھ نہیں سکتی کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

لیکن وہ تو سمجھنا چاہتی ہے زندگی کی اس موسیقی کو جس سے سارا بدن تھیا تھیا تھرکتا ہے۔ وہ ذہن کے ان میدانوں میں ہجرت کر جانا چاہتی ہے جہاں پہ برف نہیں گرتی۔ یا اپنی سہیلی کے ساتھ کاغان کی ان برفیلی وادیوں میں اُتر جانا چاہتی ہے۔ جہاں برف انسانوں پہ نہیں صرف پہاڑوں پر پڑتی ہے۔ لیکن اُسی سوچ میں لپٹا ہُوا ایک خیال ——" اے دیوی! تم فحش ہو جاؤ گی" —— اس کے نیم گرم ارادوں کو ایک بار پھر برف کی شیشیوں میں انڈیل دیتا ہے۔

ایک حقیقت

جس برانچ میں میری پہلی پوسٹنگ ہوئی - وہاں باقی دفتروں کی نسبت کچھ مختلف ماحول تھا - جگہ کی قلت کی وجہ سے افسر اور ماتحت لوگ ایک ہی لمبے ہال میں بیٹھتے تھے - اگرچہ افسروں کے بیٹھنے کی جگہ کو کارڈ بورڈ کی ایک خستہ چادر کی مدد سے باقی ہال سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی - مگر پھر بھی یہ نقاب اس باریک دانے دار آنچل کی مانند تھا جس سے کوئی حسینہ اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کو خود ہی ناکام بنا دیتی ہے -

اس دفتر کی دوسری خصوصیت یہاں کے رنگ برنگے لوگ تھے ڈرائنگ ہال میں تقریباً پچاس کے قریب آدمی کام کرتے تھے جن میں اکثریت نوجوانوں کی تھی اور جن کا سب سے بڑا شغل آپس میں ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ تھی -

ایک افسر ہونے کی حیثیت سے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ میں برانچ کے ماحول کو منظم دوں - دفتر میں

پوسٹ ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے جس بات کو شدت سے محسوس کیا وہ یہاں کا شور و غل تھا - چونکہ میں افسرانہ سختی پہ یقین نہیں رکھتا تھا اور میرا ایمان تھا کہ اگر سختی کی جگہ دوستانہ مشورہ دیا جائے تو وہ زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے - اس لیے میں نے ایک ایسی مہم شروع کی جس کا مقصد غل غپاڑہ کرنے والوں کے شعور کو جھنجھوڑنا تھا - اس سلسلے میں میں نے کئی ایک اقدام اٹھائے جس میں اپیل سے لے کر فرداً فرداً ملاقات اور پند و نصائح شامل تھے -

شور کی سب سے بڑی وجہ برانچ میں ایک ایسا شخص تھا - جس پر برسوں پرانا یہ الزام ہے کہ وہ پاگل ہے - پاگل کو چھیڑ کر مزے لینا تو بدقسمتی سے ہماری معاشرتی قدروں کا ایک حصہ ہے - برانچ کے نوجوان گروپ کے لیے اس 'پاگل' شخص کا وجود ایک ایسے کھیل کی مانند تھا جسے کھیل کر کھیلنے والے اپنی رعنائیوں اور توانائیوں میں اضافہ کرتے ہیں - وہ جب کبھی بوریت کا شکار ہوتے - آرام سے اس 'پاگل' کو چھیڑ دیتے جس کے نتیجے میں وہ گندی گندی عجیب و غریب گالیاں اس قدر اونچی آواز میں بکتا کہ پورے ماحول میں ایک ایسا سناٹا چھا جاتا جس کو صرف ایک آواز توڑ رہی ہو - پھر تھوڑی دیر بعد دھیمے دھیمے قہقہے اٹھتے اور پورا ہال ایک طوفانِ بدتمیزی کا شکار ہو

جاتا۔ ایک افسر ہونے کی حیثیت سے یہ بدنظمی میرے لیے انتہائی باعثِ کوفت ہوتی اور میں جھنجھلا کر یا تو کچھ عرصے کے لیے دفتر سے باہر نکل جاتا یا پھر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سوچتا رہتا کہ کس شور کے سرطان کا کیا ممکن علاج ہو سکتا ہے۔

مَیں نے اس "پاگل" کو کئی ایک بار اپنے پاس بُلا کر سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ جب تمہیں کوئی چھیڑتا ہے تو شور اٹھانے کی بجائے تم میرے پاس شکایت لے کر کیوں نہیں آتے تو وہ ہمیشہ مجھے بہت نیچی آواز میں سمجھانے کی کوشش کرتا کہ صاحب آپ سے پہلے کئی صاحبوں نے میری شکایت سنی ہے۔ مگر وہ ان لوگوں کو باز نہیں کر سکے۔ اس لیے مجھے مجبوراً چلانا پڑتا ہے۔ چھیڑ کی بات چونکہ ہمیشہ ہی بہت معمولی ہوتی تھی اس لیے کسی شخص پر کوئی سخت کارروائی کرنے کا جواز بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مثلاً اگر کسی شخص نے 'پاگل' کے پاس سے گزرتے ہوئے کوئی 'ایک لفظ' دیدہ دانستہ یا کسی دوسری وجہ سے کہہ دیا ہو تو 'پاگل' فوراً سر پر آسمان اٹھا لیتا تھا۔ وہ 'ایک لفظ' چاہے 'طوطا' ہو یا 'ہاتھی'، 'شمامہ' ہو یا 'سلونا'، 'سُنّی' ہو یا 'شیعہ'، 'پنسل' ہو یا 'ربڑ'، ——— 'پاگل' کو ہر اکیلے لفظ سے چڑ تھی۔

میری تمام کوششیں ناکام ہوتی نظر آ رہی تھیں کہ اچانک ایک شام قرآنِ پاک پڑھتے پڑھتے میری نظر سے ایک آیت گزری

جس کا اردو ترجمہ یہ تھا۔

"اعتدال کے ساتھ چلئے اور بولئے نیچی آواز میں۔
بے شک گدھوں کی آواز بہت بُری ہے"۔

مجھے یہ آیت بہت موزوں نظر آئی اور دوسرے ہی دن میں نے آیت کو باترجمہ چھ سات پوسٹروں میں بنوا کر پورے ہال میں چسپاں کروا دیا۔ نوجوان گروپ نے سہجا سہجا احتجاج بھی کیا۔ کیونکہ شاید آیت کھلے طور پر انہیں گدھوں سے عبارت کرتی تھی۔ لیکن چونکہ آیت قرآن کی تھی اس لیے وہ اس کے چسپاں کروانے پر کوئی اعتراض نہ کر سکتے تھے۔

آیت چسپاں کروانے کے دوسرے ہی دن مَیں دفتر میں بیٹھا اپنے مہمانوں سے اسی مسئلے پر ذکر کر رہا تھا کہ اچانک ہال سے ایک جانا پہچانا طوفان اٹھا۔ شاید پھر کسی نے "پاگل" کو "شمامہ" کہہ دیا تھا۔ وہ حسبِ دستور آسمان میں شگاف کرنے کی تمام تر کوششوں میں مصروف تھا۔ مہمانوں میں بیٹھے مجھے اس شور و غل سے انتہائی صدمہ ہوا۔ پہلی بار مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں اپنا ٹھنڈا مزاج کھو چکا ہوں۔ مَیں شدید غصّے میں تھا مَیں نے چپراسی سے کہا کہ "پاگل" کو بلاؤ۔

چند لمحوں بعد وہ اپنی معصوم صورت لیے میرے سامنے دھیرے دھیرے چلتا ہوا آ رکا۔ اس کی غریب اور معصوم شکل

دیکھتے ہی میرا سارا غصہ ایک دم یخ سا ہو گیا - میں نے اس سے کہا -

'قرآن پڑھ سکتے ہو' -

'جی ہاں' ——— اس نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا -

اس نے ایک ہی سانس میں عربی کی آیت پڑھ ڈالی - لیکن اُردو ترجمہ پڑھنے پہ وہ کچھ جھجک رہا تھا - اُس کو جھجکتے دیکھ کر میں نے تاکیداً اُردو ترجمہ پڑھنے کو کہا - میرے اصرار پہ اس نے آخرکار آہستہ آہستہ اُردو ترجمے کو ایک ایک لفظ میں توڑ کر یوں پڑھنا شروع کیا جیسے الفاظ اتنے بھاری ہیں کہ اس کی زبان ٹوٹ جائے گی - جب اس نے پورا ترجمہ پڑھ لیا تو میں نے ایک سوال پوچھا جس سے میرا مقصد یہ تھا کہ قرآن کی صحیح بات اس کو دوبارہ نئے طریقے سے سمجھائی جائے - میں نے پوچھا -

تم نے کبھی سوچا ہے کہ گدھوں کی آواز کیوں بُری ہوتی ہے -

پاگل نے چند لمحوں کے لیے سوچا اور پھر انتہائی بھولے بھولے دھیرے دھیرے - پگلے پگلے انداز میں بولا -

"جی بے وقت گھاس ملتا ہے - بے وقت پانی - آواز تو بُری ہوگی"

میرے شعوری طفل نے آج اس 'پاگل' سے ایک بالکل نیا سبق سیکھا تھا - "جی بے وقت گھاس ملتا ہے - بے وقت پانی - آواز تو بُری ہوگی" -

چھپکلی

جگہ کی قلت کی وجہ سے انہوں نے اب غسل خانے کو بھی کمرے میں ہی تبدیل کر لیا تھا - جو کچھ بھی تھا بہرحال ایک ٹھگنی سی چارپائی تو آسانی سے بچھ گئی تھی - بڑی اماں کے کہنے پہ چھتّو چپ چاپ اس نئے کمرے میں اپنا ٹین کا صندوق لے کر منتقل ہو گئی -

کمرے میں سخت تعفن تھا - ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے کمرے کی چاروں دیواروں پہ گندے انڈوں کی زردی کا لیپ کر رکھا ہے - ایک کونے میں پانی کا نلکا تھا جس کی ٹونٹی خراب تھی - بلب کی زرد روشنی میں خراب ٹونٹی سے ٹپکتا ہوا پانی اس پیپ کی مانند نظر آتا تھا جو کسی آوارہ کتّے کے زخم سے رِس رہی ہو - نلکے کے بالکل نیچے فرش پہ سبز رنگ کے زنگ کی تہیں جمی تھیں جس پہ ہر پڑنے والا پاؤں پھسل سکتا تھا -

کمرے کے ماحول سے بے خبر چھتّو اپنی چارپائی پہ سیدھی دراز لیٹی تھی - اس کا ذہن بالکل خالی تھا - کوڑا کرکٹ کے اس

ٹین کی طرح جس سے خاکروب سارا گند نکال لیتا ہے۔ ظاہری طور پر وہ سامنے دیوار پر لگے ہوئے بجلی کے بلب کو گھور رہی تھی۔ مگر دراصل وہ بالکل ساکت کچھ بھی تو نہیں کر رہی تھی۔ یونہی خالی ذہن لیے وہ مسلسل سامنے تکتی رہی۔

اچانک اُسے محسوس ہُوا کہ بلب کے بالکل نیچے ایک چھپکلی دیوار سے چمٹی خالی خالی نظروں سے دیوار پر پڑنے والی روشنی کو تک رہی ہے۔

اب اس کے ذہن میں ایک چھپکلی تھی۔

اور شاید اب وہ سوچ بھی سکتی تھی۔

دیوار سے لپٹی چھپکلی اپنا منہ اُٹھائے سامنے دیوار پر ایک رینگتے ہوئے کالے سے کیڑے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ چھپّو نے سوچا ابھی تھوڑی ہی دیر بعد یہ اس کالے کیڑے کو ہضم کر جائے گی۔ چھپو ابھی اسی ذہنی تناؤ میں تھی کہ چھپکلی نے ایک جَمپ لیتے ہوئے کالے کیڑے کو ہڑپ کر لیا ——— اب چھپکلی دیوار پر بہت تیزی سے رینگتی ہوئی ایک پتنگے کے قریب جا پہنچی پتنگا تو کالے کیڑے سے بہت بڑا ہے۔ یہ اس کو کیسے نگلے گی۔ ابھی چھپّو یہی سوچ رہی تھی کہ چھپکلی نے بڑی پھرتی سے ایک اور جَمپ لیا اور بے خبر پتنگے کے مُنہ کو اپنے مُنہ میں دبوچ لیا۔ وہ تھوڑی دیر پتنگے کے مُنہ کو اپنے مُنہ میں دبائے دیوار پر ساکت جمی

رہی۔ شاید وہ پتنگے کو نگلنے کی سکیم سوچ رہی تھی۔ چھپّو بڑے غور سے اس منظر میں دلچسپی لے رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھپکلی نے اپنے مُنہ کو دو چار بار اس طرح ہلایا جیسے کوئی کتّا ہڈی چبا رہا ہو۔ اور چھپّو کی نظروں کے سامنے ہی پورے کا پورا پتنگا چھپکلی کے پیٹ میں اُتر چکا تھا ——— وہ پھر دیوار پر جمی سامنے بیٹھے ہوئے ایک مچھّر کو شکاری نظروں سے تک رہی تھی ——— چھپّو مسلسل چھپکلی کی حرکات کو دیکھتی رہی ——— وہ شکار پر شکار کیے جا رہی تھی۔

اچانک چھپّو نے محسوس کیا کہ چھپکلی کا زرد پیٹ پھُول چکا ہے۔ چھپّو نے سوچا کہ اب تو یہ مزید شکار نہیں کرے گی۔ مگر چھپکلی اپنے پھُولے ہوئے پیٹ کو دیوار پر رینگتے ہوئے زد میں آنے والے ہر کیڑے مکوڑے کو ہڑپ کرتی جا رہی تھی۔

کس قدر زہر ہوگا اس کے پیٹ میں ——— یہ سوچتے ہی چھپو کا دل خراب ہونے لگا۔ کاش کہیں پاس ہی نمک ہوتا تو وہ ایک چُٹکی اپنی زبان پر دھر لیتی۔ ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ دھڑام سے غسل خانے کا دروازہ کھُلا اور ایک لمبا تڑنگا نوجوان بھاری قدموں سے چلتا ہُوا چھپّو کی چارپائی کے قریب آ رُکا۔

اندر آنے والے آدمی کو دیکھتے ہی چھپّو کے دماغ میں ایک

زوردار دھماکہ ہوا جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹا ہو، اور وہ پوری شدت سے چیخی ——

"بھاگ جاؤ حرام زادے۔ دیکھتے نہیں اُلو کے پٹھے میرا پیٹ پھولا ہوا ہے"۔

دروازے میں کھڑی ششدر بڑی اماں سوچ رہی تھی کہ چھپو نے آج تک اپنے کسی گاہک سے ایسی بدتمیزی نہیں کی۔